بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

کسی ملک میں جب کبھی کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر تہذیبی، سماجی اور بعض اخلاقی قدروں میں ایک تلاطم سا برپا ہو جاتا ہے۔ پرانی قدریں نئی قدروں سے ٹکراتی ہیں اور ماضی کی دیرینہ روایات کا تصادم وقت کے جدید مطالبوں اور تقاضوں سے ہوتا ہے تو اس وقت سوسائٹی کے ارباب فکر ہمیشہ تین طبقات میں بٹ جاتے ہیں، ایک طبقہ جو قدامت پرست کہلاتا ہے ان لوگوں کا ہوتا ہے جو انقلاب کی قوت و طاقت کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے اور اب بھی لکیر کے فقیر بنے ماضی کی ہر چیز کو چمٹے اور جدید تقاضوں سے آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ماڈرن کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ماضی کی ہر روایت سے (اگر قولاً نہیں تو عملاً) اپنا تعلق منقطع کر کے ہر نئی چیز کو قبول کر لیتے ہیں اور جس طرف ہوا کا رُخ ہوتا ہے وہ بھی اسی سمت چل پڑتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے بالمقابل ایک چھوٹا سا گروہ ان حضرات کا ہوتا ہے جو زمانہ کی تغیر پذیر فطرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کو نہ قدیم سے محض اس لئے کہ وہ قدیم ہے کوئی عشق ہوتا ہے اور نہ وہ ہر چیز جس پر جدید ہونے کا ٹھپہ لگا ہو اُس سے چڑ ہوتی ہے۔ ان میں تجزیہ و تحلیل اور تنقید و تبصرہ کی صلاحیت ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ انسانی معاشرہ ارتقا پذیر ہے۔ معاشرہ کے ایک خاص دور میں جو تہذیبی اور سماجی قدریں بنتی ہیں ان میں رطب و یابس اور حقیقت و مجاز دونوں کی ملاوٹ ہوتی ہے یعنی اُن کے بعض اجزا تو حقیقی اور واقعی ہوتے ہیں جن میں تغیر و تبدل کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ گنجائش اور بعض اجزا بعض خارجی اور زمانی و مکانی اسباب کا نتیجہ ہونے کے باعث غیر واقعی ہوتے ہیں اس بنا پر ان کی قدر و قیمت ابدی نہیں بلکہ محض ہنگامی اور وقتی ہوتی ہے۔

اس بنا پر انقلاب کے نتیجہ میں جب قدیم و جدید کی کشمکش اور ماضی و حال کی باہمی آویزش کا معرکہ بپا ہوتا ہے تو یہ تیسرا گروہ قدیم و جدید دونوں کا تجزیہ و تحلیل کر کے ان کے صالح اور غیر صالح عناصر و اجزا کا بالغ نظری کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور پھر حک و فک اور ترمیم و تنسیخ کے اصول سے کام لے کر

قدیم کے ابدی اقدار عالیہ کا پیوند جدید کے صالح اور واقعی اجزاء کے ساتھ اس طرح لگاتا ہے کہ انسانی تمدن و اجتماع کا درخت نئے ماحول اور نئی آب و ہوا میں از سرِ نو سرسبز و شاداب اور تنومند ہو سکے اور اس طرح سماج کا قافلہ صحت مندی کے ساتھ سرگرم سفر رہ سکے۔

پوری دنیا کی تاریخ پڑھ جائیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ فتح و کامرانی اس تیسرے طبقہ کو ملی ہوئی ہے کیونکہ انسانیت کی تاریخ ارتقاء کے طبعی تقاضے اور وقت کے ناگزیر مطالبہ کی تکمیل یہی طبقہ کرتا ہے چنانچہ بڑے بڑے مصلحین اور ریفارمرس اسی طبقہ کے افراد و اشخاص ہوئے ہیں، اگرچہ اس طبقہ کو پہلے طبقہ کی طرف سے بہت شدید اور دوسرے طبقہ کی جانب سے نسبتۃً کم مخالفت کا ہر دور اور ہر زمانہ میں سامنا اور ان کے ہاتھوں سخت قسم کے سب و شتم اور مصائب و آلام کا مقابلہ کرنا پڑا ہے لیکن آخر ام دونوں طبقوں کو شکست ہوئی ہے اور جو مخالف تھے ان کے لئے پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے اور جو چیزیں انقلاب کے آغاز میں معاشرہ کے عام افراد کے لئے ناقابل قبول تھیں ایک زمانہ گزرنے کے بعد وہ اُن کے لئے نہ صرف گوارا بلکہ ضروری ہوگئی ہیں۔ دور نہ جائیے صرف برصغیر ہند و پاک کو دیکھئے۔ اب سے ایک سو برس پہلے انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ملک جس انقلاب سے دوچار ہوا اس کے نتیجہ میں کتنی چیزیں تھیں جن کی اس وقت شدید ترین مخالفت کی گئی لیکن آج معاشرہ نے ان کو اپنی زندگی کا جز بنا لیا ہے۔

گذشتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالم اسلام میں جو ایک نہایت عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور جس کے اثرات بہت دوررس اور ہمہ گیر ہیں اُس نے اسلامی معاشرہ کو پھر از سرِ نو قدیم و جدید کی معرکہ آرائی میں مبتلا کر دیا ہے اس لئے یہ وقت علماء کے لئے خاص طور پر بڑا نازک اور اہم ہے۔ [illegible] اپنے فرض ارشاد و ہدایتِ عوام سے اس وقت عہدہ برا ہو سکتے ہیں جب کہ وہ روشن ضمیری اور بیدار مغزی کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں کا جائزہ لیکر اعتدال و توازن کی راہ پیدا کر سکیں گے اور اس کے لئے اولین شرط دونوں کو اچھی طرح سمجھنا اور اُن کا مطالعہ کرنا ہے ورنہ محض مقاومتِ مجہول خواہ کتنی ہی مضبوط ہو وقت کی تیز رفتاری کے لئے زنجیرِ پا نہیں بن سکتی۔

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ اگست میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دو منتسبین مولانا محمد جلیل کیرانوی استاذ اور مولانا محمد مبارک علی نائب مہتمم دار العلوم دیوبند واصل بحق ہو کر اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اوّل الذکر (المتولد ۱۳۱۸ھ) نے اگرچہ دورۂ حدیث حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کے عہدِ صدارت میں تمام کیا تھا لیکن درحقیقت پروردہ تھے حضرت شیخ الہند کے گھرانے کے ہی۔ نو برس کی عمر تھی کہ ان کے والد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر گئے تھے۔ یہ اس آستانۂ قدس کو ایسے چمٹے کہ مرتے دم تک اسے نہ چھوڑا۔ اس لئے حضرت شیخ الہند کے خادم خاص اور شریکِ جلوت و خلوت تھے اس بنا پر حضرت شیخ الہند کی مشہور "ریشمی خطوط" والی تحریک کے جزو کل سے خوب واقف اور اس کے محرمِ اسرار تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے بڑے مصائب اور شدائد برداشت کئے لیکن تحریک کا بھید آشکارا نہیں کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ادھر ادھر مدرس رہے۔ آخر میں دیوبند آ گئے تھے اور درس کی خدمات انجام دیتے تھے۔ مولانا محمد مبارک علی صاحب جن کی عمر چھیاسی برس کے قریب ہوگی حضرت شیخ الہند کے شاگردِ خاص اور آپ سے بیعت بھی تھے اور حضرت کی اسارتِ مالٹا کے بعد حضرت الاستاذ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تجدیدِ بیعت کر لی تھی اور حضرت مفتی صاحبؒ کے خدام خاص میں شامل ہو کر حضرت موصوف ہی سے طریقہ نقشبندیہ میں اجازتِ بیعت و ارشاد حاصل کی۔ ایک عرصہ تک ٹونک میں صدر مفتی رہے اور ریشمی خطوط کی تحریک سے بھی تعلق خاص رہا غالباً ۱۹۱۹ء میں مدراس (پرنامبٹ) تشریف لے گئے تھے اور پھر بریلی کے قدیم مدرسہ مصباح العلوم میں صدارتِ درس کی خدمت انجام دی۔ اب کم و بیش اڑتیس سال سے دار العلوم دیوبند میں نائب مہتمم کے عہدہ پر فائز تھے۔ اہتمام و انتظام میں دسترس کے علاوہ کبھی کبھی حدیث کی کسی کتاب کا درس بھی دیتے تھے۔ تقویٰ و طہارت اور اخلاق و شمائل کے لحاظ سے سلف صالحین کا نمونہ اور مثال تھے صد حیف! دنیا اب ایسے حضرات سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

تغمدھما اللہ بمغفرتہ و رحمتہ